Al-Mīthāq *(Research Journal of Islamic Theology)*
ISSN: 2791-0989 (P), 2791-0997 (E)
Volume 05, **Issue** 02, April - June 2026, **PP**: 52-75
Open Access at: https://almithaqjournal.org/

Article QR

عہدِ نبوی میں مسلم مسیحی تعامل کے مظاہر

Manifestations of Muslim-Christian Interaction in the Prophetic Era

1. Najia Jamil najiajamil9@gmail.com	*Ph. D Scholar, Department of Islamic Studies, The Women University, Multan.*
2. Dr. Azmat Jabeen azmat_jabeen@yahoo.com	*Visiting Teacher, Department of Arabic, International Islamic University, Islamabad.*
3. Syed Adeel Shah syedadeelahmedgilani@icloud.com	***Ph. D Scholar,*** *Department of Islamic Studies, Al-Hamd Islamic University, Islamabad.* ***Lecturer,*** *Department of Islamic Culture, University of Art and Culture, Janshuro, Sindh.* ***Research Associate,*** *Muslim Study Center, Islamabad.*

How to Cite:	Najia Jamil, Dr. Azmat Jabeen and Syed Adeel Shah. 2026: "Manifestations of Muslim-Christian Interaction in the Prophetic Era". Al-*Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 5 (02): 52-75.		
Article History:	**Received**: 02-05-2026	**Accepted**: 12-06-2026	**Published**: 20-06-2026

Copyright:	**©The Authors**
Licensing:	This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

Conflict of Interest: Author(s) declared no conflict of interest.

Abstract & Indexing

DRJI, Advanced Sciences Index, CiteFactor, Asian Research Index, SCI, Google Scholar, اردو جرائد اشاریہ, تحقیقات تحقیقاتی اشاریہ, ADL Asian Digital Library, EuroPub

Publisher

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

عہدِ نبوی میں مسلم مسیحی تعامل کے مظاہر

Manifestations of Muslim-Christian Interaction in the Prophetic Era

1. **Najia Jamil**
   Ph. D Scholar, Department of Islamic Studies, The Women University, Multan.
   najiajamil9@gmail.com

2. **Dr. Azmat Jabeen**
   Visiting Teacher, Department of Arabic, International Islamic University, Islamabad.
   azmat_jabeen@yahoo.com

3. **Syed Adeel Shah**
   Ph. D Scholar, Department of Islamic Studies, Al-Hamd Islamic University, Islamabad.
   Lecturer, Department of Islamic Culture, University of Art and Culture, Janshuro, Sindh.
   Research Associate, Muslim Study Center, Islamabad.
   syedadeelahmedgilani@icloud.com

Abstract

Muslim-Christian relations during the Prophetic era constitute an important dimension of early Islamic history and provide valuable insights into the nature of interreligious engagement in the formative period of Islam. This article examines the various manifestations of interaction between the Prophet Muhammad (peace be upon him), the early Muslim community, and Christian individuals and groups. Drawing upon classical Sīrah literature, Qur'ānic texts, and contemporary scholarly discussions, the study analyzes key episodes including the accounts of Baḥīrā the monk and Waraqah ibn Nawfal, the migration of Muslims to Abyssinia and their encounter with the Christian ruler al-Najāshī (the Negus), the visit of the Christian delegation of Najrān to Madinah, and the Prophet's correspondence with Christian rulers. The article also investigates Qur'ānic portrayals of Christians and explores how these portrayals relate to the historical circumstances in which they were revealed.The study argues that Muslim-Christian relations in the Prophetic period were neither monolithic nor static; rather, they reflected a complex spectrum of religious dialogue, political engagement, diplomatic relations, theological debate, and peaceful coexistence. While the Qur'ān critiques certain Christian doctrines from an Islamic theological perspective, it also acknowledges the piety, humility, and moral integrity of many Christians. The analysis demonstrates that the Prophet's interactions with Christians were generally characterized by justice, mutual respect, intellectual engagement, and the invitation to faith through dialogue rather than coercion. Furthermore, the article highlights the significance of contextualizing both historical reports and Qur'ānic passages in order to achieve a balanced understanding of early Muslim-Christian relations. The findings contribute to contemporary discussions on interfaith relations by illustrating how the Prophetic model provides important principles for religious coexistence, constructive dialogue, and mutual understanding in pluralistic societies.

Keywords: *Prophet Muhammad, Muslim-Christian Relations, Sīrah, Qur'ān, Najrān Delegation, Negus of Abyssinia, Interfaith Dialogue, Early Islam.*

تمہید

اسلام اور مسیحیت دنیا کے دو بڑے مذاہب ہیں جن کے پیروکار صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ مختلف نوعیت کے مذہبی، فکری، سماجی اور سیاسی روابط میں رہے ہیں۔ ان تعلقات کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے عہدِ نبوی کا مطالعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل

ہے، کیونکہ یہی وہ دور تھا جس میں اسلام نے ایک منظم مذہبی اور سماجی تحریک کے طور پر ظہور کیا اور نبی اکرم ﷺ کو مختلف مذہبی برادریوں، بالخصوص مسیحیوں، کے ساتھ براہِ راست تعامل کے مواقع میسر آئے۔ سیرتِ نبوی، احادیث، تاریخی روایات اور قرآنی آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور ابتدائی مسلم جماعت کے مسیحیوں کے ساتھ تعلقات یک رُخی یا محدود نوعیت کے نہیں تھے بلکہ ان میں مکالمہ، مذہبی مباحثہ، باہمی احترام، سیاسی روابط، سفارتی تعلقات اور بعض مواقع پر تعاون کے مختلف مظاہر پائے جاتے تھے۔ بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل سے متعلق روایات، حبشہ کے عیسائی فرمانروا نجاشی کے ساتھ مسلمانوں کے روابط، وفدِ نجران کی مدینہ آمد، اور مختلف مسیحی حکمرانوں کو ارسال کیے گئے دعوتی خطوط اس تعامل کی اہم مثالیں ہیں۔ مزید بر آں قرآن مجید میں مسیحیوں کے بارے میں موجود متنوع بیانات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر نے مسیحی برادری کو مختلف تاریخی اور سماجی حالات کے تناظر میں دیکھا اور اس کے ساتھ تعلقات کو اسی پس منظر میں متعین کیا۔ چنانچہ عہدِ نبوی میں مسلم مسیحی تعامل کا مطالعہ نہ صرف ابتدائی اسلامی تاریخ کی بہتر تفہیم کے لیے ضروری ہے بلکہ عصرِ حاضر میں بین المذاہب تعلقات، مذہبی ہم آہنگی اور مسلم۔ مسیحی مکالمے کے لیے بھی اہم فکری رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

عیسائیت سے اسلام کے مقتبس ہونے کا مسئلہ

نبی اکرم ﷺ کو 610ء میں نبوت عطا ہوئی، اور اگلے بائیس برسوں کے دوران، یعنی 632ء میں آپ ﷺ کی وفات تک آپ ﷺ نے توحید اور اس کے اخلاقی تقاضوں پر مشتمل اپنا پیغام سب سے پہلے مکہ میں پیش کیا۔ 622ء میں آپ ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اسی پیغام کی تبلیغ یثرب میں جاری رکھی، جو بعد میں مدینہ کے نام سے معروف ہوا۔ یہودیوں اور مسیحیوں کے ساتھ آپ ﷺ کا تعامل ایک ایسا موضوع ہے جس پر مسلم اور غیر مسلم مصنفین کے مابین خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مسلم مصنفین مسیحیوں کے ساتھ آپ ﷺ کے روابط کو کم اہمیت دیتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پیغام پر کسی بھی خارجی ماخذ، خواہ وہ مسیحی ہو، یہودی ہو یا کوئی اور، کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ان مصنفین کا مقصد یہ ہے کہ پیغامِ اسلام کی "اصالت" پر زور دیا جا سکے اور اس روایتی مؤقف کی تائید کی جا سکے کہ نبی اکرم ﷺ کے پیغام کا سرچشمہ آپ ﷺ کی ذاتی فکر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی تھی۔ اس کے برعکس بعض غیر مسلم مصنفین اسلامی پیغام کو بالکل غیر اصیل قرار دیتے ہیں اور یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ وہ محض یہودیت، مسیحیت، قبل از اسلام عربی مذہب یا ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ عناصر کے کسی امتزاج سے ماخوذ تھا۔ تحقیقات کا عمیق مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین کی جانب سے اسلام کی فکری اور مذہبی بنیادوں کے بارے میں مختلف اور ایک دوسرے سے خاصے مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

- "Charles Cutler Torrey" (1863ء–1956ء) مذہبی زبانوں، بائبلی مطالعات اور مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ کا ماہر تھا۔ اس کو قرآن مجید کے مآخذ اور بائبل کی متنی تنقید کے حوالے سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس مستشرق نے اپنی کتاب "The Jewish Foundation of Islam" میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ اسلام کی تشکیل میں یہودی اثرات بنیادی حیثیت رکھتے تھے[1]۔
- سکاٹش مستشرق "Richard Bell" (1876ء–1952ء) عربی اور علوم اسلامیہ کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے معروف کاموں میں قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کے تعارف پر مشتمل دستاویز ہے۔ رچرڈ بیل نے تاریخی تنقیدی طریقہ اختیار کرتے ہوئے قرآن مجید کا مطالعہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے قرآن مجید کا حالیہ نسخہ تاریخی ارتقاء سے گزر کر اپنی

تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "The Origin of Islam in its Christian Environment" میں اسلام کے مسیحی ماحول سے تعلق اور مسیحی اثرات پر زور دیا[2]۔

- "Patricia Crone" اور "Michael Cook" نے اپنی معروف کتاب "Hagarism: The Making of the Islamic World" میں یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام کی ابتدائی تشکیل میں "سامری"(Samaritan) اثرات بھی شامل تھے[3]۔
- "Joshua Finkel" (1899ء-1964ء) مذہبی زبانوں اور علوم اسلامیہ کا ماہر تھا۔ اسلامی تاریخ، عربی ادب اور قرآنی مطالعات کے حوالے سے اس کے متعدد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنے مضمون "Jewish, Christian, and Samaritan Influences on Arabia" میں ان تینوں مذہبی روایات یعنی یہودیت، مسیحیت اور سامریت کے عرب پر ممکنہ اثرات کا جائزہ لیا تھا[4]۔

المختصر بعض مستشرقین اسلام کی تشکیل میں بنیادی طور پر یہودی اثرات دیکھتے ہیں۔ بعض مسیحی اثرات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ جبکہ بعض یہودیت، مسیحیت اور سامریت تینوں کے ممکنہ اثرات کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کو مسلمان علماء نے نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کے محاکمہ پر سیر حاصل تحقیقی مباحث پیش کر رکھے ہیں[5]۔

"David Waines"(1949ء-2025ء) برطانیہ میں علوم اسلامیہ کا متخصص اور "Lancaster University" میں پروفیسر تھا۔ اسلام کے تعارف پر اس کی کتاب "Introduction to Islam" کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اس نے اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب، قرآنی مطالعات، تصوف اور مسلم سماج کے ثقافتی اور سماجی ارتقاء پر متعدد تصنیفات پیش کر رکھی ہیں۔ اسلامی کی اصالت سے متعلق اس کی رائے ہے کہ مذکورہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں غالباً مبالغہ اور حد سے زیادہ سادہ کاری پائی جاتی ہے[6]۔

کتبِ سیرت میں متعدد ایسے واقعات مذکور ہیں جن میں آپؐ کی مسیحیوں سے ملاقاتوں اور رابطوں کا ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ مستشرقین کے ہاں ان واقعات و روایات کی تاریخی حیثیت اور قابلِ اعتماد ہونے کا مسئلہ بھی عہد نامہ جدید کی طرح علمی بحث و اختلاف کا موضوع ہے۔ پھر بھی ان روایات کو مکمل طور پر رد کر دینے کی کوئی معقول وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ یہ سوال کہ ان ملاقاتوں اور روابط نے نبی اکرم ﷺ کے پیغام کی تشکیل یا اس کی ترقی میں کس حد تک کردار ادا کیا، مستشرقین کے ہاں یہ ایک کہیں زیادہ پیچیدہ اور متنازع مسئلہ قرار دیا جاتا ہے[7] تاہم مسلمان علماء کے مطابق آپ ﷺ نے کسی یہودی یا عیسائی سے دینی امور میں استفادہ نہیں کیا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ مستشرقین نے اس ضمن میں ہمیشہ دور کی کوڑی لانے کی ایسی کوشش کی ہے جو علمی و تحقیقی اعتبار سے کسی قسم کی افادیت کی حامل نہیں ہے۔

مسیحیوں کے ساتھ نبوی تعامل

اگر ہم نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے بارے میں سب سے اہم روایتی سوانحی ماخذ، یعنی ابن اسحاق (م: 767ء) کی کتاب "سیرة رسول الله" کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں پانچ ایسے بنیادی واقعات درج ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ اور ابتدائی مسلم برادری کا کسی نہ کسی صورت میں مسیحیوں کے ساتھ براہِ راست رابطہ یا ملاقات رہی ہے[8]۔

پہلا تعامل: بحیرا راہب سے ملاقات

ان واقعات میں سے پہلا نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے بھی پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ابن اسحاق کے مطابق، جب نبی اکرم ﷺ تقریباً بارہ برس کی عمر میں اپنے چچا "ابو طالب" کے ساتھ ایک تجارتی قافلے میں شام کی طرف سفر کر رہے تھے۔

راستے میں صحرا میں ایک راہب سے آپؐ کی ملاقات ہوئی جس کا نام "بحیرا" تھا۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق، جب قافلہ بحیرا کے عبادت خانے کے قریب سے گزر رہا تھا تو اس راہب نے دیکھا کہ ایک بادل نبی اکرم ﷺ پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ پھر جب قافلہ ایک مقام پر رکا تو ایک درخت کی شاخیں جھک گئیں اور اس طرح نیچے آگئیں کہ آپؐ ان کے سائے میں آگئے۔ یہ منظر دیکھ کر راہب کو تجسس محسوس ہوا۔ اس نے قافلے کے افراد کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو غور سے دیکھا اور آپؐ کے دونوں کندھوں کے درمیان "مہر نبوت" دیکھی، جس سے مراد ایک مخصوص جسمانی نشان سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس راہب نے قافلے کے دیگر افراد کو نصیحت کی کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی اچھی طرح حفاظت کریں تا کہ آپؐ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے[9]۔

واقعہ کی استنادی حیثیت

قدیم محدثین اور سیرت نگار علماء کے درمیان بحیرا راہب سے متعلق روایت کی صحت و ضعف کے بارے میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اس روایت کو قابلِ قبول قرار دیا ہے، جبکہ بعض نے اس کے بعض حصوں یا پوری روایت پر اعتراضات وارد کیے ہیں۔ دار السلام کے شائع کردہ "سیرت انسائیکلوپیڈیا" میں اس واقعہ کی تخریج کے بعد اس کی سند کے بارے میں علماء کی آراء پیش کی گئی ہیں۔ ان آراء کو یہاں نقل کیا جاتا ہے جن کے مطابق:

- امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب قرار دیا ہے۔
- امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ امام حاکم کے مطابق یہ روایت امام بخاری اور امام مسلم کی مقرر کردہ شرائط کے مطابق ہے۔
- عصرِ حاضر کے متعدد محققین، جیسے علامہ ناصر الدین البانی، محمد عرجون، شیخ شعیب ارناؤط اور شیخ عبد القادر ارناؤط نے بھی امام حاکم کی اس رائے کی تائید کی ہے۔
- حافظ ابن حجر عسقلانی اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کے تمام راوی ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں۔ ان کے نزدیک اس روایت میں بنیادی طور پر کوئی خرابی دکھائی نہیں دیتی، البتہ سیدنا ابو بکر صدیقؓ اور سیدنا بلالؓ کے ذکر سے متعلق اشکال موجود ہے۔ وہ احتمال ظاہر کرتے ہیں کہ کسی راوی نے سہواً دوسری روایت کے الفاظ اس روایت میں شامل کر دیے ہوں۔
- اسی طرح امام ابن قیم بھی اس حصے کو واضح غلطی قرار دیتے ہیں۔
- امام ابن کثیر اور ابن سید الناس نے بھی روایت میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ کے تذکرے پر اعتراض کیا ہے، لیکن اس اضافے کو الگ کر کے باقی روایت کو قبول کیا ہے۔
- اس کے برعکس علامہ ذہبی نے "مستدرک حاکم" کی تلخیص میں اس روایت پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ روایت من گھڑت معلوم ہوتی ہے اور اس کے بعض اجزاء سراسر باطل ہیں۔ اپنی کتاب "السيرة النبوية" میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت نہایت ضعیف ہے۔ ان کے بقول اس واقعے میں حضرت ابو بکرؓ کا ذکر تاریخی اعتبار سے محلِ نظر ہے، کیونکہ اس وقت ان کی عمر تقریباً دس برس کے قریب بنتی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے تقریباً ڈھائی سال چھوٹے تھے۔ اسی طرح حضرت بلالؓ کا ذکر بھی درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ حضرت ابو بکرؓ نے انہیں نبوت کے بعد خرید کر آزاد کیا تھا، لہٰذا اس زمانے میں ان کا اس قافلے کے ساتھ موجود ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔
- علامہ ذہبی مزید استدلال کرتے ہیں کہ اگر نبی اکرم ﷺ پر بادل سایہ فگن تھا تو پھر درخت کے سائے کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ کسی مستند روایت میں یہ نہیں ملتا کہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں کبھی ابو طالب کو بحیرا راہب

کے اس واقعے کی یاد دہانی کرائی ہو۔ نہ ہی قریش نے اس واقعے کو بطور دلیل پیش کیا، حالانکہ اگر یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہوتا تو اپنی غیر معمولی نوعیت کی وجہ سے فوراً مشہور ہو جاتا۔ قریش عام طور پر اس قسم کے غیر معمولی واقعات کو نقل کرنے اور پھیلانے میں خاص دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے اس واقعے کا وسیع شہرت نہ پانا بھی علامہ ذہبی کے نزدیک اس روایت کے ضعف کی ایک اہم دلیل ہے۔ علامہ ذہبی اپنی تنقید کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر بحیرا راہب کے واقعے میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی نشانیاں اس قدر واضح طور پر ظاہر ہو چکی تھیں، تو پھر خود نبی اکرم ﷺ کو بھی اپنی نبوت کے بارے میں پہلے سے یقین ہونا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں جب غارِ حرا میں پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی، تو آپ ﷺ پر وہ حیرت اور اضطراب طاری نہ ہوتا جس کا ذکر روایات میں ملتا ہے، اور نہ ہی آپ ﷺ خوف اور تشویش کی کیفیت میں حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لے جاتے۔ وہ مزید یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر ابو طالب نے بحیرا راہب کی باتوں سے متاثر ہو کر اور ممکنہ خطرات کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ کو شام سے واپس لے آنے کا فیصلہ کیا تھا، تو بعد میں وہ کس طرح دوبارہ آپ ﷺ کو حضرت خدیجہؓ کے تجارتی سامان کے ساتھ شام کے سفر پر بھیجنے پر آمادہ ہو گئے؟ ان کے نزدیک یہ بات بھی اس روایت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے۔

- علامہ ذہبی روایت کے اسلوب پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اس حدیث کی زبان اور اندازِ بیان عام روایات سے مختلف محسوس ہوتا ہے اور اس میں صوفیانہ اصطلاحات اور طرزِ اظہار کی جھلک نمایاں ہے۔ تاہم وہ یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ ابن عائذ نے اپنی کتاب المغازی میں اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت بلالؓ کے ذکر کے بغیر نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت کی اصل بنیاد ان اضافی تفصیلات کے بغیر بھی موجود ہے۔
- ڈاکٹر مہدی رزق اللہ کا رجحان ان علماء کی رائے کی طرف ہے جنہوں نے بحیرا راہب والی روایت کو قبول کیا ہے۔ ان کے مطابق اس روایت کو قبول کرنے والوں میں امام ترمذی، امام حاکم، ابن سید الناس، ابن الاثیر الجزری، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، جلال الدین سیوطی، محمد ناصر الدین البانی اور دیگر قدیم و جدید علماء شامل ہیں۔ ڈاکٹر مہدی رزق اللہ کے نزدیک علامہ ذہبی نے روایت کے متن پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان کی وضاحت اور تطبیق محدثین کے معروف اصولوں کے مطابق کی جا سکتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس روایت کو مجموعی طور پر قابلِ قبول سمجھتے ہیں اور ان اعتراضات کو روایت کے مکمل رد کے لیے کافی نہیں سمجھتے[10]۔
- مسلمان علماء میں سے بحیرہ راہب سے متعلق روایات پر ایک تفصیلی مقالہ اردن یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے استاد ڈاکٹر زیاد سلیم العبادی نے بھی لکھا ہے۔ ان کا حتمی موقف یہ ہے کہ بحیرا راہب کا واقعہ اپنی اصل کے اعتبار سے ثابت اور قابلِ قبول ہے، اور جمہور محدثین و سیرت نگاروں نے اسے قبول کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اگرچہ روایت کے بعض الفاظ، خصوصاً یہ اضافہ کہ "ابو بکرؓ نے بلالؓ کو نبی ﷺ کے ساتھ بھیجا"، تاریخی اشکالات کی وجہ سے منکر یا مدرج معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان جزوی کمزوریوں کی بنا پر پورے واقعے کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ روایت کی سند مجموعی طور پر قابلِ اعتماد ہے اور امام ترمذی، حاکم، ابن کثیر، ابن حجر، سیوطی اور دیگر متعدد علماء نے اس کی صحت یا قبولیت کی تائید کی ہے۔ مصنف یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ امام ذہبی اس روایت کے اولین اور نمایاں ناقد ہیں، جبکہ بعد کے اکثر ناقدین نے بنیادی طور پر انہی کے اعتراضات کو دہرایا ہے۔ تاہم مصنف کے نزدیک ان اعتراضات کا معقول جواب موجود ہے اور وہ واقعے

کی اصل تاریخی حیثیت کو مجروح نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ بحیرا راہب کا واقعہ سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک ثابت شدہ حصہ ہے، اگرچہ اس کی بعض تفصیلات تنقید اور تحقیق کی متقاضی ہیں[11]۔

- دوسری جانب پاکستان میں شائع والی ایک تحقیق کے مطابق بحیرا راہب کے ساتھ نبی ﷺ کی ملاقات کے حوالے سے عیسائیوں کے دینی ادب میں بھی کچھ روایات پائی جاتی ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق یہ روایات موضوع ہیں اور ان کا مقصد نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کی تکذیب کرنا اور اسلام کو عیسائیت کا چربہ قرار دینا ہے[12]۔

چنانچہ مذکورہ تفصیلات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ بحیرہ راہب سے نبی اکرم ﷺ کی ہونے والی اس ملاقات کی صحیح اسناد موجود ہیں البتہ متون میں بعض واقعات ایسے ہیں جو درایتی اعتبار سے درست ثابت نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے علماء نے اس میں سے حضرت ابو بکر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما کے بارے میں پیش کی گئی معلومات کو ناقابل قبول قرار دے رکھا ہے۔ البتہ کلیسیائی مآخذ میں مذکور اس نوعیت کی روایات کو کلی طور پر تسلیم کرنا مشکل ہے۔

مسلم مسیحی تعامل سے ضمن میں واقعہ کی وضاحت

بحیرا کے واقعے کو اس دعوے کی تائید کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی ایک مسیحی راہب نہ صرف آپؐ کی نبوت کو تسلیم کر رہا تھا بلکہ اس کی پیش گوئی بھی کر رہا تھا۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ اس ملاقات کے بارے میں شامی آرتھوڈوکس ذرائع سے منقول بعض مسیحی روایات بھی موجود ہیں۔ بظاہر یہ روایات اس ملاقات کی ایک بیرونی اور آزادانہ تصدیق فراہم کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم ان روایات کی بھی ایک ممکنہ توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ بعد کے ادوار کے شامی آرتھوڈوکس مسیحی یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت کے تحت انہیں ایک خاص مقام حاصل ہونا چاہیے کیونکہ ان کے بقول وہی پہلے مسیحی تھے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت کو تسلیم کیا تھا[13]۔

اس سلسلے میں وہ مسیحی مثال مددگار ثابت ہو سکتی ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے وقت مشرق سے آنے والے تین مجوسی دانشمندوں کا ذکر ہے[14]۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ واقعہ تاریخی طور پر حقیقتاً پیش آیا تھا؟ اس بارے میں ہم مکمل یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تاہم یہ امکان بعید بھی نہیں کہ یہ ایک ایسی روایت ہو جو بعد کے زمانے میں اس خیال کی تائید کے لیے بیان کی گئی ہو کہ حضرت عیسیٰ کا پیغام صرف بنی اسرائیل تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک عالمگیر پیغام تھا۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اس کہانی میں حضرت عیسیٰ کی عظمت اور اہمیت کو ان کی بپتسمہ اور علانیہ دعوت کے آغاز سے بھی پہلے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ جب اس پہلو کا بحیرا کے واقعے کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ایک دلچسپ مماثلت سامنے آتی ہے۔

جس طرح بحیرا کی روایت میں ایک مسیحی راہب نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو ان کی بعثت سے پہلے پہچان لیتا ہے اسی طرح عہد نامہ جدید مینں مجوسیوں والی روایت میں غیر یہودی دانشمند حضرت عیسیٰ کی غیر معمولی حیثیت کو ان کی زندگی کے بالکل ابتدائی مرحلے میں تسلیم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ دونوں روایات ایک دوسرے کے ساتھ رکھنے پر خاصی معنی خیز اور غور طلب معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرا تعامل: ورقہ بن نوفل سے ملاقات

دوسرا واقعہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے کچھ ہی عرصے بعد پیش آیا۔ یہ واقعہ اس نہایت گہرے اور غیر معمولی تجربے کے بعد کا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے کسی صورت میں "فرشتہ جبرائیلؑ" کا مشاہدہ کیا اور آپؐ کو ایک پیغام پڑھنے (یا سنانے) کا حکم

دیا گیا۔ یہ پیغام بعد میں قرآن مجید کی "سورۂ علق" کی ابتدائی پانچ آیات کی صورت میں محفوظ ہوا۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق اس تجربے کے بعد حضرت محمد ﷺ اس کی حقیقت اور مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ممکن ہے کہ آپؐ کو یہ اندیشہ بھی لاحق ہوا ہو کہ کہیں آپؐ پر کوئی غیر معمولی کیفیت یا جنون طاری تو نہیں ہو گیا۔ اس موقع پر آپؐ کو آپؐ کی زوجہ حضرت خدیجہؓ کے ایک چچازاد بھائی "ورقہ بن نوفل" کی طرف سے اطمینان اور حوصلہ ملا۔

ابن اسحاق ورقہ بن نوفل کو "ایک ایسے مسیحی شخص" کے طور پر بیان کرتے ہیں "جس نے آسمانی صحائف کا مطالعہ کیا تھا اور جو ایک عالم تھے"۔ مزید یہ کہ وہ "مسیحی ہو چکے تھے، صحائف کا مطالعہ کرتے تھے اور تورات و انجیل کے پیروکاروں سے علم حاصل کرتے تھے"۔ جب ورقہ نے نبی اکرم ﷺ کا یہ تجربہ سنا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ نبی اکرم ﷺ عربوں کے نبی بننے والے ہیں اور اس لیے آپؐ کو دل مضبوط رکھنا چاہیے اور حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے[15]۔

مسلم مسیحی تعامل کے حوالے سے اس واقعہ کی توضیح

کسی حد تک "ورقہ بن نوفل" والے واقعہ کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ وہ بھی نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرتے ہیں۔ تاہم دو عوامل ایسے ہیں جو مجموعی طور پر اس روایت کو نسبتاً زیادہ قابلِ اعتماد اور معتبر بناتے ہیں:

- پہلا عامل یہ ہے کہ یہ واقعہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد پیش آتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک ایسے واقعہ پر ردِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے جس کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں ہم نسبتاً زیادہ یقین رکھتے ہیں۔
- دوسرا عامل یہ ہے کہ یہ واقعہ مکہ میں پیش آتا ہے اور یہ ان محدود مگر قابلِ قبول معلومات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے جو ہمیں مکہ میں مسیحیوں کی موجودگی کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہیں۔ اگرچہ مکہ میں مسیحی موجودگی کے بارے میں ہمارے پاس معلومات بہت زیادہ نہیں ہیں پھر بھی ورقہ بن نوفل کا وہاں موجود ہونا اس تاریخی صورتِ حال سے متصادم نہیں معلوم ہوتا۔

چنانچہ اگرچہ اس روایت میں بھی نبوتِ محمدی ﷺ کی تصدیق کا ایک نمایاں عنصر موجود ہے، پھر بھی مذکورہ دو وجوہات کی بنا پر اسے مجموعی طور پر پہلی روایت کے مقابلے میں زیادہ قابلِ اعتبار سمجھا جا سکتا ہے۔

تیسرا تعامل: شاہِ حبشہ

اگلا واقعہ خود نبی اکرم ﷺ سے نہیں بلکہ اس مسلمان جماعت سے متعلق ہے جس نے تقریباً 615ء میں آپؐ کے حکم پر مکہ سے ہجرت کر کے "مملکتِ اکسوم" (Axum) یعنی "حبشہ" (Abyssinia) کا رخ کیا[16]۔ اکسوم ایک مسیحی سلطنت تھی جو "مونوفیزی مسیحیت" کی پیروکار تھی۔ اس لیے جب مکہ کے حالات ابتدائی مسلمانوں کے لیے دشوار ہو گئے تو حبشہ کو پہلی پناہ گاہ کے طور پر منتخب کرنا یقیناً ایک اہم اور معنی خیز امر تھا۔ اس زمانے میں اکسوم کے فرمانروا کا لقب "نجاشی" (Negus) تھا۔ جب مکہ کے حکمران قبیلے "قریش" نے مسلمانوں کو واپس مکہ لانے کی کوشش میں ایک سفارتی وفد حبشہ بھیجا تو ابن اسحاق نے نجاشی، اس کے ساتھ موجود بشپوں اور ان کی مقدس کتابوں اور مہاجر مسلمانوں کے قائدین کے درمیان ہونے والی ایک نہایت دلچسپ گفتگو نقل کی ہے۔

جب نجاشی نے مسلمانوں سے ان کے دین کے بارے میں سوال کیا تو ان کے نمائندے "حضرت جعفر بن ابی طالبؓ" نے جواب دیا:

> "اے بادشاہ! ہم ایک جاہل قوم تھے۔ ہم بتوں کی پرستش کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، بے حیائیوں کا ارتکاب کرتے تھے، خاندانی رشتوں کو توڑتے تھے، مہمانوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے، اور ہم میں

سے طاقتور کمزوروں کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے یہاں تک کہ اللہ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا، جس کے نسب، سچائی، امانت داری اور حلم کو ہم جانتے تھے۔ اس نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اللہ کی وحدانیت کا اقرار کریں، صرف اسی کی عبادت کریں، اور ان پتھروں اور بتوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہم اور ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، وعدوں کو پورا کرنے، صلہ رحمی کرنے، مہمان نوازی اختیار کرنے، جرائم اور خونریزی سے بچنے کا حکم دیا۔ اس نے ہمیں بے حیائیوں سے، جھوٹ بولنے سے، یتیموں کا مال کھانے سے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس نے ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزے کے بارے میں احکام دیے۔ (یہاں جعفرؓ نے اسلام کے احکام کا ذکر کیا)۔ چنانچہ ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے، اور جو کچھ وہ اللہ کی طرف سے لائے تھے اس کی پیروی کی۔ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرایا۔ ہم نے ان چیزوں کو حرام جانا جنہیں انہوں نے حرام قرار دیا اور ان چیزوں کو حلال مانا جنہیں انہوں نے حلال قرار دیا۔ اس پر ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی، اس نے ہمیں سخت اذیتیں دیں، اور ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کی کوشش کی تاکہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر دوبارہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں اور ان برے اعمال کو جائز سمجھنے لگیں جو ہم پہلے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ ہم پر غالب اگئے، ہم پر ظلم کرنے لگے، ہماری زندگی تنگ کر دی، اور ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان حائل ہو گئے، تو ہم آپ کے ملک میں اگئے، کیونکہ ہم نے تمام دوسروں پر آپ کو ترجیح دی۔ یہاں آپ کی پناہ میں ہم نے امن پایا ہے اور ہمیں امید ہے کہ جب تک ہم آپ کے پاس رہیں گے، ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا ان کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہے جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس پر "جعفر بن ابی طالبؓ" نے قرآن مجید کی سورت مریم کا ایک حصہ تلاوت کیا، جس میں حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت اور پیدائش کا بیان ہے۔ ابن اسحاق کے مطابق، جب نجاشی نے یہ آیات سنیں تو وہ اس قدر رویا کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، اور بشپ بھی اس قدر روئے کہ ان کے صحیفے بھیگ گئے۔ اس کے بعد نجاشی نے کہا کہ "یقیناً یہ پیغام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام ایک ہی منبع و مشرب سے جاری ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو مکہ والوں کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود مکہ والوں نے ایک اور کوشش کی تاکہ نجاشی مسلمانوں کی سرپرستی واپس لے لے۔ انہوں نے نجاشی سے کہا کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی الوہی مقام کے حامل نہیں ہیں بلکہ وہ ایک "مخلوق" ہیں۔ اس پر جعفر بن ابی طالبؓ نے دوبارہ قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے جواب دیا کہ:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ[17]

مسیح، عیسیٰ ابنِ مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں اور اس کا وہ کلمہ ہیں جسے اس نے مریم کی طرف القا کیا تھا۔

اس جواب کو سن کر نجاشی نے زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اس کے عقیدے اور مسلمانوں کے عقیدے کے درمیان فرق اس لکڑی کی لمبائی سے بھی زیادہ نہیں ہے۔ اس طرح نجاشی نے ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے مؤقف کو قبول کیا اور ان کی حفاظت بر قرار رکھنے کا فیصلہ کیا[18]۔

چوتھا تعامل: وفدِ نجران

ابن اسحاق کے بیان کردہ چوتھا واقعہ ایک لحاظ سے تیسرے واقعے کا عکس ہے کیونکہ اس میں طاقت اور اختیار کا توازن الٹ چکا ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہجرت کے بعد کے اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب نبی اکرم ﷺ یثرب / مدینہ میں ایک بااثر اور مضبوط قائد کے طور پر مستحکم ہو چکے تھے۔ وہاں، غالباً 628ء / 7ھ کے قریب آپؐ کے پاس نجران سے مسیحیوں کا ایک وفد آیا۔ نجران جنوبی عرب میں مونوفیزی مسیحیت کا ایک اہم مرکز تھا۔ ابن اسحاق کے مطابق، اس وفد کی قیادت تین افراد کر رہے تھے:

- عاقب: قوم کا سربراہ تھا۔
- سید: ان کا منتظم یا انتظامی نگران تھا۔
- اسقف: ان کا مذہبی پیشوا تھا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس وفد کے سربراہ کا نام عبد المسیح تھا جس کا معنی ہے: مسیح کا بندہ۔ اسقف کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایک نہایت بڑا عالم تھا اور مسیحی مذہب کے بارے میں غیر معمولی علم رکھتا تھا۔ اس کی علمی قابلیت اور مذہبی جوش و جذبے کی وجہ سے بازنطینی سلطنت کے شہنشاہوں نے بھی اسے اعزازات سے نوازا تھا۔ اس وفد کے دورے کا مقصد بنیادی طور پر سیاسی تھا یعنی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کسی قسم کے معاہدے پر بات چیت کرنا۔ ابن اسحاق کے مطابق، جب یہ مسیحی وفد مدینہ پہنچا تو نبی اکرم ﷺ عصر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ پھر جب ان مسیحیوں کی عبادت کا وقت آیا تو انہیں بھی مسجد میں اپنی عبادت ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔ بعد ازاں جب مذاکرات شروع ہوئے تو مسیحیوں کو "اسلام" قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو پہلے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا یہ کام کر چکے ہیں۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ یہاں "اسلام" یا "اطاعت و تسلیم" کی زبان کسی حد تک مبہم تھی، کیونکہ یہ واضح نہیں تھا کہ دعوت "اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے" کی تھی یا "نبی اکرم ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے" کی تھی۔ یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے جب ان کو اطاعت تسلیم کرنے کا حکم دیا تو یقیناً اس اطاعت کا مفہوم اسلام قبول کرنا ہی تھا۔ اس حکم کو مبہم قرار دینا غیر علمی و خلطِ مبحث کا ہتھکنڈا معلوم ہوتا ہے۔ مسیحیوں کا دعویٰ تھا کہ کم از کم اللہ کے سامنے تو وہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے ہی سرِ تسلیم خم کر چکے تھے۔ تاہم ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جواب دیا کہ تین چیزیں انہیں حقیقی اطاعت و تسلیم سے روکتی ہیں:

- ان کا یہ عقیدہ کہ خدا کا ایک بیٹا ہے؛
- صلیب کی تعظیم و عبادت؛
- اور خنزیر کا گوشت کھانا۔

اس کے بعد ایک طویل مسیحیاتی (Christological) بحث شروع ہوئی، جس کا مرکز حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں قرآن مجید کی متعدد آیات تھیں۔ بحث کے اختتام پر ایک چیلنج پیش کیا گیا کہ اس اختلاف کا فیصلہ "مباہلہ" کے ذریعے کیا جائے، یعنی دونوں فریق دعا کریں کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو ان پر خدا کی لعنت ہو۔ کافی غور و فکر کے بعد مسیحی وفد نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے انہوں نے پُرامن طور پر اختلاف برقرار رکھنے کو ترجیح دی اور اپنے وطن واپس چلے گئے، جبکہ انہیں اپنے مذہب پر عمل جاری رکھنے کی اجازت بھی دی گئی[19]۔

مسلم مسیحی تعامل کے حوالے سے مذکورہ دونوں واقعات کی توضیح

حبشہ اور مدینہ میں پیش آنے والی دو ملاقاتیں غالباوہ واقعات ہیں جن کی تاریخی بنیاد سب سے زیادہ مضبوط معلوم ہوتی ہے۔ان دونوں واقعات کے درمیان موجود تقابل بھی نہایت سبق آموز ہے خصوصااس اعتبار سے کہ ان میں دونوں برادریوں کی طاقت اور اثرورسوخ کی حیثیت ایک دوسرے کے برعکس نظر آتی ہے۔حبشہ میں مسلمان کمزور پوزیشن میں تھے اور پناہ کے طالب تھے۔ وہاں وہ درخواست گزار کی حیثیت رکھتے تھے، جبکہ مسیحی حکمران اور اس کی برادری طاقت اور اختیار کے منصب پر فائز تھے۔ اس کے برعکس مدینہ میں صورتِ حال بدل چکی تھی۔اب نبی اکرم ﷺ اور مسلم برادری سیاسی اور سماجی اعتبار سے مستحکم اور بااثر تھے جبکہ نجران کے مسیحی وفد کو مذاکرات اور معاہدے کی غرض سے ان کے پاس آناپڑا۔ اس طرح اس موقع پر نسبتادرخواست گزار یامحتاج فریق مسیحی تھے۔چنانچہ یہ دونوں واقعات نہ صرف مسلمانوں اور مسیحیوں کے ابتدائی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ چند ہی برسوں میں دونوں برادریوں کے درمیان طاقت اور اثرورسوخ کاتوازن کس طرح تبدیل ہو گیاتھا۔

یہ واقعات نبی اکرم ﷺ اور مسیحیوں کے درمیان روابط کی اکلوتی مثالیں نہیں ہیں۔اس نوعیت کے دیگر کئی واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔صرف دومزید مثالوں کاذکر کیاجائے تومکہ میں ورقہ بن نوفل کے علاوہ غالبامسیحیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی موجود تھی۔اس جماعت میں غیر ملکی افراد، غلام،اور بعض مقامی نومسلم مسیحی بھی شامل تھے۔اسی طرح یثرب / مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری دور میں، نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک قبطی مسیحی باندی تھیں جن کانام ماریہ تھا۔ آپؐ کے آخری برسوں میں ان کی خاص اہمیت اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے اکلوتے بیٹے کو جنم دیاجس کانام ابراہیم رکھاگیا۔تاہم یہ بچہ نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں ہی غالبااپنی دوسری سالگرہ سے پہلے ہی وفات پاگیا۔

پانچواں تعامل: مسیحی حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط

مسیحیوں اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان کسی نہ کسی نوعیت کے رابطے یاملاقات سے متعلق آخری اہم واقعہ آپؐ کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتاہے۔ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ اس زمانے میں نبی اکرم ﷺ نے عرب کے ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کو خطوط بھیجے، جن میں انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔یہ خطوط صرف مسیحی حکمرانوں ہی کو نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق ایک قاصد ساسانی شہنشاہ خسرو پرویز کے پاس بھی بھیجاگیاتھا[20]۔ہم ان روایات کے بارے میں کیارائے قائم کریں؟بعض واقعات کے بارے میں دوسروں کی نسبت زیادہ تاریخی احتیاط اور تشکیک اختیار کرنامناسب معلوم ہوتاہے کیونکہ خصوصاپہلے اور آخری واقعات میں ان کہانیوں کے پس منظر میں ایک قسم کاالٰہیاتی یامذہبی محرک نسبتاآسانی سے دیکھاجاسکتاہے۔

مسلم مسیحی تعامل کے حوالے سے ان خطوط کی توضیح

مستشرقین کے ہاں ہرقل اور دیگر حکمرانوں کو خطوط بھیجے جانے کے بارے میں بعض شبہات پیداکرنے والی بات یہ ہے کہ اس روایت کوایک ایسے نظریے کے جواز کے طور پر بھی دیکھاجاسکتاہے جواسلامی تاریخ کے نسبتابعد کے مرحلے میں نمایاں ہوا۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کاپیغام صرف عرب کے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں تھابلکہ ایک عالمگیر پیغام تھاجو تمام انسانوں کے لیے تھا۔چنانچہ غیر ملکی حکمرانوں کواسلام قبول کرنے کی دعوت دینے والی یہ روایات اس دعوے کی تائید کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ خود نبی اکرم ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں بیرونی سلطنتوں کے حکمرانوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تھے تو اس سے اسلام کے عالمگیر ہونے کے تصور کو براہِ راست نبی اکرم ﷺ کی اپنی عملی زندگی سے اساس فراہم ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض مستشرقین کے نزدیک یہ امکان موجود ہے کہ ان روایات نے بعد میں ابھرنے والے اس نظریے کو تقویت دی ہو کہ پیغامِ نبوی صرف اہلِ عرب کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تھا۔

مستشرقین کے مطابق چونکہ حکمرانوں کے نام نبی اکرم ﷺ کے خطوط کی ترسیل سے متعلق روایات صحیح الاسناد نہیں ہیں، اس لیے ان کی بنا پر اسلام ایک عالم گیر مذہب کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریے کا مسلمان علماء نے علمی و تحقیقی بنیادوں پر محاسبہ و محاکمہ کر کے ثابت کر رکھا ہے کہ نبوی رسائل سے متعلق یہ روایات مستند اور قابلِ اعتماد ہیں۔ اس ضمن میں بعض مسلمان علماء کی مستقل کتابیں بھی سامنے آچکی ہیں جو مذکورہ استشراقی نظریہ کی کمزوری کو نمایاں کرتی ہیں[21]۔

مسیحیوں کے ساتھ قرآنی تعامل

جب ہم قرآن مجید میں مسیحیوں کے بارے میں آنے والے بیانات کا جائزہ لینے کی طرف بڑھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے مجموعی پیغام کی طرح ان بیانات میں بھی خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ نہایت اہم ہے کہ مختلف قرآنی بیانات کو ان کے اپنے تاریخی اور سیاقی پس منظر میں سمجھا جائے۔ بالفاظ دیگر اگر قرآن کے پیغام میں مختلف ادوار اور مراحل کو پہچانا جاسکتا ہے تو یہ مراحل نبی اکرم ﷺ کی دعوتی اور نبوی زندگی کے مختلف ادوار سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرنے والے عوامل میں سے ایک عامل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف اوقات میں مسلم برادری کے تعلقات پہلے سے موجود یہودی اور مسیحی برادریوں کے ساتھ کس نوعیت کے تھے۔

اس نظریے کی مزید وضاحت کے لیے پروفیسر "جیک وارڈنبرگ"(Jacques Waardenburg) کا ایک مقالہ مفید معلوم ہوتا ہے[22]۔ وارڈنبرگ دیگر محققین کی سابقہ تحقیقات کی بنیاد پر یہ تجویز پیش کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پیغام کی نشوونما اور ارتقا کو جزوی طور پر ان تین بڑے مذہبی نظاموں کے ساتھ آپؐ کے تعامل اور ملاقاتوں کے تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے جو آپؐ کے زمانے کے عرب میں موجود تھے۔ یہ تین مذہبی گروہ درج ذیل تھے:

- مشرکینِ مکہ
- یہودِ مدینہ
- عرب کے مسیحی

وارڈنبرگ کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے پیغام کی تشکیل میں ان تینوں مذہبی برادریوں کے ساتھ روابط اور مکالمے نے کسی نہ کسی حد تک کردار ادا کیا۔ یہاں واضح طور پر ایک زمانی اور جغرافیائی ارتقا کا عمل بھی دکھائی دیتا ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور مختلف علاقوں سے رابطے بڑھنے کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ کے افقِ نظر اور دعوتی تجربات میں وسعت آتی گئی۔ بالفاظِ دیگر اگر قرآنی پیغام میں ایک خاص قسم کا تناؤ دکھائی دیتا ہے تو اس پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تناؤ ایک طرف نبی اکرم ﷺ کے اس پختہ یقین اور شعور کے درمیان تھا کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں اور اپنے ہم عصروں تک ایک الٰہی پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ دوسری طرف ان مختلف گروہوں کے درمیان تھا جنھوں نے یا تو اس پیغام اور آپؐ کے دعوے کو قبول کیا یا اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کے اس یقین کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ آپؐ کی نبوت کوئی منفرد اور الگ تھلگ واقعہ نہیں تھی، بلکہ یہ

نبوتوں کے ایک طویل سلسلے کی تازہ ترین کڑی تھی۔ یہ سلسلہ ایک طرف عرب کے مذہبی حافظے میں موجود ان تین شخصیات تک پہنچتا تھا جنہیں قدیم زمانوں میں انبیاء کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ ان میں حضرت ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام شامل تھے۔ دوسری طرف یہ سلسلہ ان شخصیات تک بھی پہنچتا تھا جو وسیع تر دنیا کے سابقہ موحد مذاہب خصوصا یہودیت اور مسیحیت، میں گہری مذہبی اہمیت رکھتی تھیں۔ ان میں حضرت ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی توقع یہ تھی کہ اسی بنیاد پر عرب کے یہودی اور مسیحی آپؐ کے پیغام کو قبول کر لیں گے کیونکہ آپؐ اپنے آپ کو انہی انبیاء کی روایت اور سلسلے کا تسلسل قرار دے رہے تھے۔ لیکن عملی تجربے نے نسبتا جلد یہ واضح کر دیا کہ عمومی طور پر ایسا ہونے والا نہیں تھا۔ اسی لیے قرآنی پیغام کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت اہم حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا گہرا اور مسلسل واسطہ مسیحیوں سے پہلے یہودیوں سے پڑا۔ چنانچہ قرآنی پیغام کی تشکیل اور ارتقا میں یہودیوں کے ساتھ ابتدائی تعاملات نے ایک بنیادی کردار ادا کیا، جبکہ مسیحیوں کے ساتھ زیادہ گہرے روابط بعد کے مرحلے میں سامنے آئے۔

عرب میں مسیحیوں کی موجودگی سب سے زیادہ سرحدی اور اطرافی علاقوں میں نمایاں تھی، یعنی ان خطوں میں جو پڑوسی ریاستوں کی سرحدوں سے متصل تھے۔ اس کے برعکس یہودیوں کی موجودگی عرب کے مرکزی علاقوں میں کہیں زیادہ اہم اور نمایاں تھی۔ خصوصا اس شہر یثرب میں جو نبی اکرم ﷺ کے پیغام اور دعوتی سرگرمیوں کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا[23]۔

نبی اکرم ﷺ کی دعوتی زندگی کے پہلے مرحلے کا مرکز مکہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کی آبادی میں یہودیوں کی کوئی قابلِ ذکر تعداد موجود نہیں تھی، بالکل اسی طرح جیسے مسیحی بھی وہاں بہت کم تھے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مکہ کے لوگ دونوں مذہبی روایات، یعنی یہودیت اور مسیحیت، کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات رکھتے ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہودی اور مسیحی افراد مکہ آتے جاتے تھے اور دوسری وجہ یہ کہ مکہ کے باشندے تجارتی اور دیگر مقاصد کے لیے شہر سے باہر سفر کرتے تھے۔ تاہم ان دونوں مذہبی برادریوں کے مستقل پیروکاروں کی تعداد مکہ میں خاصی محدود تھی۔ اس کے برعکس یثرب میں یہودیوں کی ایک بڑی اور اچھی طرح ثابت شدہ موجودگی تھی۔ وہاں کم از کم تین یہودی قبائل آباد تھے۔ حالیہ برسوں میں نبی اکرم ﷺ کے ان یہودی قبائل کے ساتھ تعلقات اور ان کے بارے میں اختیار کی گئی پالیسیوں پر علمی اور مناظرانہ نوعیت کا وسیع مباحثہ ہوا ہے اور یہ موضوع معاصر تحقیق کا ایک اہم میدان بن چکا ہے[24]۔

مسیحیوں کے مثبت رویوں کا ذکر

چنانچہ مسیحیوں سے زیادہ آپ ﷺ کا واسطہ یہودیوں کے ساتھ پہلے پڑا تھا۔ مدینہ میں نسبتاً جلد یہ بات واضح ہو گئی کہ شہر کے اکثر یہودی نبی اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت کو قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے اگر مدینہ کے یہودیوں کے بارے میں بعض قرآنی بیانات میں ایک خاص درجے کی سختی یا ناگواری نظر آتی ہے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ مثلا:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا[25]

آپ ایمان والوں کے ساتھ دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے۔

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس امید کو برقرار رکھا گیا تھا کہ شاید مسیحی نبی اکرم ﷺ کے دعوے کو قبول کرنے کے لیے زیادہ آمادہ ہوں گے۔ اسی آیت کے اگلے حصے میں ہے:

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ

آپ ایمان والوں کے ساتھ محبت میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں: ہم نصاریٰ ہیں۔

اس مثبت رائے کی وجوہات اسی آیت کے بقیہ حصے اور اس کے بعد والی آیت میں بیان کی گئی ہیں:

ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّيسِينَ وَرُهۡبَانًاوَأَنَّهُمۡ لَايَسۡتَكۡبِرُونَ۔ وَإِذَاسَمِعُوامَاأُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعۡيُنَهُمۡ تَفِيضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّاعَرَفُوامِنَ الۡحَقِّۖيَقُولُونَ رَبَّنَاآمَنَّافَاكۡتُبۡنَامَعَ الشَّاهِدِينَ[26]

یہ اس لیے کہ ان میں عالم (پادری) اور راہب موجود ہیں اور اس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل کیا گیا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ حق کو پہچان لینے کے باعث ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں: 'اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، پس ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ اور مسیحیوں کے بارے میں آنے والے دیگر مثبت بیانات بھی غالباً اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں جب یہ امید ابھی باقی تھی کہ مسیحی برادری نبی اکرم ﷺ کے پیغام کے لیے زیادہ مثبت ردِ عمل ظاہر کرے گی۔

بعد ازاں جب مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ پیدا ہونے والے تنازعات اور کشیدگیاں یا تو طاقت کے ذریعے یا قبولِ اسلام کے ذریعے حل ہو گئیں اور جب نبی اکرم ﷺ کی دعوتی اور سیاسی بصیرت کا دائرہ وسیع ہو کر عرب کے بڑے حصے کو اپنے اندر شامل کرنے لگا تو مسیحیوں کے ساتھ براہِ راست روابط اور ملاقاتوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اس کی ایک نمایاں مثال نجران کے مسیحی وفد کا مدینہ آنا ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان ملاقاتوں کا ایک سیاسی پہلو بھی تھا، کیونکہ زیرِ بحث سوالات میں سے ایک یہ تھا کہ آیا مسیحی مسلم برادری کی سیاسی حاکمیت اور اقتدار کو تسلیم کریں گے یا نہیں؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک الٰہیاتی پہلو بھی موجود تھا کیونکہ ان ملاقاتوں میں نبی اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت اور مسیحی عقائد و اعتقادات بھی زیرِ بحث آتے تھے۔ ان مکالمات اور ملاقاتوں کے دوران یہ بات واضح ہونے لگی کہ عمومی طور پر عرب کے مسیحی بھی ضروری نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت کو قبول کر لیں۔ اس صورتِ حال کے ردِ عمل میں قرآن مجید میں مسیحیوں کے بارے میں آنے والے بعض بیانات کا لہجہ بھی رفتہ رفتہ زیادہ تنقیدی، منفی اور مخالفانہ ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا قرآن مجید مسیحیوں کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے، اس کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے سیاق و سباق کو مدِ نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ مختلف آیات مختلف تاریخی حالات اور مختلف مراحل میں نازل ہوئیں، اور ان کے معانی کو سمجھنے کے لیے ان حالات کو پیشِ نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی ایک آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ:

قَاتِلُواالَّذِينَ لَايُؤۡمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَابِالۡيَوۡمِ الۡآخِرِ وَلَايُحَرِّمُونَ مَاحَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَايَدِينُونَ دِينَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواالۡكِتَابَ حَتَّىٰ يُعۡطُواالۡجِزۡيَةَ عَن يَدٍ وَهُمۡ صَاغِرُونَ [27]

ان لوگوں سے جنگ کرو جنہیں کتاب دی گئی ہے، جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یومِ آخرت پر، اور نہ اس چیز کو حرام سمجھتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ ممکنہ طور پر مذکورہ آیات سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 82،83 کے بعد والے زمانے میں نازل ہوئی تھیں۔ مذکورہ آیت ایسے حالات کی عکاسی کرتی ہے جن میں نبی اکرم ﷺ اور اہلِ کتاب (یعنی یہودیوں اور مسیحیوں) کے درمیان ایک خاص درجے کی کشیدگی اور تناؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اس نقطۂ نظر کے مطابقسورۃ المائدہ کی آیت نمبر 82،83 ایک ایسے مرحلے کی نمائندگی کرتی ہے جب بعض مسیحیوں کے بارے میں نسبتاً مثبت توقعات موجود تھیں جبکہ سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت ایک بعد کے دور

کی صورتِ حال کو ظاہر کرتی ہے۔ اس دور میں سیاسی اور مذہبی اختلافات زیادہ نمایاں ہو چکے تھے۔ اس کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں یہودیوں اور مسیحیوں کے بارے میں مختلف بیانات کو سمجھنے کے لیے ان کے نزولی اور تاریخی سیاق کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ مختلف آیات مختلف حالات اور مختلف ادوار میں نازل ہوئیں اور ان کا لہجہ بھی انہی حالات کے مطابق مختلف ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید میں مسیحیوں کے بارے میں آنے والے بیانات کو مسلم مفسرین کس طرح سمجھتے ہیں، اس موضوع پر اپنی نہایت مفصل تحقیق میں "جین میک آلیف"(Jane McAuliffe) کہتی ہیں کہ قرآن مجید میں سات ایسے مقامات ہیں جنہیں عموماً کم از کم بعض مسیحیوں کے بارے میں مثبت رویہ ظاہر کرنے والی آیات سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 82،83 بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل آیات بھی اس زمرے میں شمار کی جاتی ہیں:

- إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواوَالَّذِينَ هَادُواوَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًافَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُونَ[28]

بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور نصاریٰ اور صابئین، جو بھی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

- إِذْ قَالَ اللَّهُ يَاعِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُواوَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُواإِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ[29]

جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تمہیں واپس لینے والا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں کافروں سے پاک کرنے والا ہوں، اور تمہارے پیروکاروں کو قیامت کے دن تک منکروں پر غالب رکھنے والا ہوں۔

- وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَاأُنزِلَ إِلَيكُمْ وَمَاأُنزِلَ إِلَيهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ[30]

اور یقیناً اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر بھی جو تمہاری طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو ان کی طرف نازل کیا گیا، اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے ہیں۔

- وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُواالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَاأُنزِلَ إِلَيهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوامِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَايعْمَلُونَ[31]

اور اگر وہ تورات اور انجیل اور اس چیز کو قائم رکھتے جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے رزق پاتے۔ ان میں ایک جماعت اعتدال پر قائم ہے، لیکن ان میں سے بہت سے لوگ برے اعمال کرتے ہیں۔

- الَّذِينَ آتَينَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ يؤْمِنُونَ ۔وَإِذَايتْلَىٰ عَلَيهِمْ قَالُواآمَنَّابِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَاإِنَّاكُنَّامِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ۔أُولَٰئِكَ يؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَينِ بِمَاصَبَرُوا... وَإِذَاسَمِعُوااللَّغْوَ أَعْرَضُواعَنْهُ[32]

جن لوگوں کو اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی گئی تھی، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں..." اور آگے ان اہلِ کتاب کی تعریف کی گئی ہے جو قرآن کو حق مانتے ہیں اور صبر و نیک کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

- ثُمَّ قَفَّينَاعَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَاوَقَفَّينَابِعِيسَى ابْنِ مَرْيمَ وَآتَينَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَافِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً[33]

پھر ہم نے ان کے نقشِ قدم پر اپنے رسول بھیجے، اور ان کے بعد عیسیٰ ابنِ مریم کو بھیجا اور انہیں انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کے دلوں میں نرمی اور رحمت رکھ دی۔

جین میک آلیف کے مطابق یہ آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن مجید تمام مسیحیوں یا تمام اہلِ کتاب کے بارے میں ایک ہی قسم کا حکم نہیں دیتا، بلکہ بعض مقامات پر ایسے مسیحیوں اور اہلِ کتاب کی واضح تعریف بھی کرتا ہے جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں، حق کو پہچانتے ہیں، عاجزی اختیار کرتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔ تاہم جین میک آلیف کی پیش کی گئی بحث کا نتیجہ یہ واضح کرتا ہے کہ بعد کے مسلم مفسرین کی نظر میں ان آیات میں جس مسیحی قبولیت یا تحسین کا ذکر کیا گیا ہے وہ مطلق اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ مشروط ہے۔ یعنی مفسرین کے نزدیک قرآن مجید جن مسیحیوں کی تعریف کرتا ہے وہ ہر زمان و مکان کے تمام مسیحی نہیں ہیں بلکہ وہ مخصوص مسیحی ہیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور آپؐ پر نازل ہونے والی وحی کو قبول کیا یا کم از کم اگر ان کے تاریخی حالات اجازت دیتے تو وہ اسے قبول کر لیتے۔ اسی بنا پر میک آلیف ان افراد کو "قرآنی مسیحی" کا نام دیتی ہیں اور ان کی تعریف یوں کرتی ہیں:

"وہ مسیحی جنہوں نے یا تو نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور ان پر نازل ہونے والی وحی کو قبول کر لیا تھا یا اگر ان کے تاریخی حالات نے اجازت دی ہوتی تو وہ اسے قبول کر لیتے[34]"۔

چنانچہ میک آلیف کے مطابق بعد کے مسلم تفسیری لٹریچر میں ان مثبت قرآنی آیات کو عموماً اس انداز میں نہیں سمجھا گیا کہ وہ تمام مسیحیوں کی غیر مشروط توثیق کرتی ہیں، بلکہ ان کی تطبیق ایسے مسیحیوں پر کی گئی جو کسی نہ کسی صورت میں اسلام اور نبوتِ محمدی ﷺ کے لیے آمادگی یا قبولیت رکھتے تھے۔ تاہم مسیحیوں کے بارے میں ان عمومی طور پر مثبت، اگرچہ مشروط، بیانات کے ساتھ ساتھ بعض ایسے بیانات بھی موجود ہیں جو کہیں زیادہ منفی معلوم ہوتے ہیں، اور ان میں سے بہت سی آیات شرک اور کفر کے موضوع کے ضمن میں آتی ہیں۔

قرآن مجید میں کہیں بھی مسیحیوں کو صراحت کے ساتھ "**مشرکون**" یا "**کافرون**" یا "**منکرون**" قرار نہیں دیا گیا۔ یہ اصطلاحات عموماً بالترتیب مکہ اور عرب کے مشرکین اور ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے پیغام کو رد کرتے ہیں۔ تاہم بعض آیات میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کو کفر اور شرک دونوں کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ[35]

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا: 'اللہ ہی مسیح ابنِ مریم ہے... جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے۔"

مزید فرمان ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ[36]

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا: 'اللہ تین کا تیسرا ہے... اگر وہ اپنی اس بات سے باز نہ آئے تو ان میں سے جنہوں نے کفر کیا ہے انہیں دردناک عذاب پہنچے گا۔

ان آیات کی تشریح مشکل ہے کیونکہ عام مسیحیوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برابر خدائی اختیار کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی عیسائیوں کا خیال ہے کہ وہ تین خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں جن میں سے ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب امکان یہی ہے کہ قرآن مجید میں مذکور ان الزامات کا اصل ہدف مسیحی ہی تھے اور بعد کے اکثر مسلم مفسرین نے بھی

ان آیات کو اسی طرح سمجھا ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت جزیہ، جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے، کے علاوہ قرآن مجید میں بعض دیگر آیات بھی خاص طور پر مسیحیوں کے بارے میں نہایت سخت موقف اختیار کرتی ہیں اور ان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسیحی نہ صرف کفر کے مرتکب ہیں بلکہ شرک کے بھی مجرم ہیں۔ اس طرح مسیحیوں کو ایک معنی میں خدا کے فیصلے اور مواخذے کے تحت سمجھا گیا ہے۔ قرآن مجید پر ایک حالیہ تحقیق قرآن میں مذکور "کافرون" کے بارے میں آیات کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تحقیق میں واضح کیا گیا ہے کہ مکی دور میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ کافروں پر خدا کا فیصلہ اور عذاب براہِ راست اللہ کی مداخلت کے ذریعے نازل ہو گا۔ لیکن مدنی دور میں بتدریج یہ تصور زیادہ نمایاں ہوتا گیا کہ الٰہی فیصلہ اور سزا اہلِ ایمان کی جماعت کے ذریعے نافذ ہوا اور عملی صورت اختیار کرے گی[37]۔

لہٰذا قرآن مجید کے مسیحیوں کے بارے میں بیانات کے حوالے سے بعض آیات نسبتاً زیادہ مثبت ہیں اور ان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسیحیوں کو یہودیوں کے ساتھ بنیادی طور پر اہلِ کتاب کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ تاہم بعض دوسری آیات سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ مسیحیوں کو کبھی یہودیوں کے ساتھ ملا کر اور کبھی ان سے الگ طور پر شرک یا کفر کا مرتکب سمجھا جانا چاہیے۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آج قرآن مجید میں یہودیوں اور مسیحیوں کے بارے میں آنے والے حوالوں کو سمجھتے وقت اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان کا بنیادی مخاطب اور مرجع اس دور کی پوری دنیا میں پھیلی ہوئی یہودی اور مسیحی برادری نہیں اس زمانے کے عرب میں رہنے والے یہودی اور مسیحی تھے۔ اسی حقیقت کی روشنی میں بعض ایسی آیات کی وضاحت ہوتی ہے جو بظاہر حیران کن معلوم ہوتی ہیں، مثلاً:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ[38]

اور یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ ياعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّي إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ[39]

اور جب اللہ فرمائے گا: اے عیسیٰ ابنِ مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو دو معبود بنالو؟

یہ آیات اس وقت کے عرب کے مخصوص یہودی اور مسیحی گروہوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ نہ تو "عزیر کو خدا کا بیٹا" کہنا ایسا عقیدہ تھا جو عام یہودیوں میں پایا جاتا تھا، اور نہ ہی "عیسیٰ اور مریم دونوں کو خدا "ماننا ایسا عقیدہ تھا جو عام مسیحیوں کے ہاں رائج تھا[40]۔ لہٰذا قرآن مجید کے مسیحیوں کے بارے میں بیانات کو ایک تین فریقی مکالمے (three-cornered discussion) کے حصے کے طور پر سمجھنا چاہیے۔ یعنی مسیحیوں کے بارے میں قرآن کے بیانات در حقیقت یہودیوں کے ساتھ جاری بحث و مباحثے کا بھی ایک حصہ ہیں۔ چنانچہ اسی پس منظر میں قرآن مجید حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی تصدیق کرتا ہے، باوجود اس کے کہ یہودی اس دعوے کو قبول نہیں کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن مجید حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں روایتی مسیحی عقائد کے بعض پہلوؤں کو بھی رد کرتا ہے۔ ان میں عقیدہ ابنیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے[41]۔ بالکل اسی طرح جس طرح ابتدائی مسیحی نقطۂ نظر میں یہودیت اور یہودیوں کے بارے میں آراء مختلف ادوار میں حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں اور یہودی برادریوں کے باہمی تعلقات سے گہرے طور پر متاثر ہوئیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں پائے جانے والے تصورات بھی عرب میں موجود مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان تعلقات کی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوتی زندگی کے مختلف مراحل میں یہ تعلقات کبھی

زیادہ خوشگوار اور کبھی زیادہ کشیدہ ہوتے گئے۔

ابتدائی مسیحیوں کا رومی ریاست کے بارے میں رویہ بھی اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ جب رواداری کا ماحول موجود تھا اور حکومت نسبتاً نرم اور موافق طرزِ عمل اختیار کرتی تھی تو مسیحی ریاست کے ساتھ اپنی وفاداری کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے اور اس کے بارے میں مثبت رائے رکھتے تھے۔ لیکن جب ریاست نے مسیحیوں کو ستانا اور ان پر ظلم و ستم کرنا شروع کیا تو ان کا نقطۂ نظر بھی حسبِ توقع تبدیل ہو گیا۔ یہاں تک کہ عہد نامہ جدید[42] بعض مواقع پر رومی ریاست کو "وحشی درندہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس مثال میں بھی سیاق و سباق نے متن پر گہرا اثر ڈالا اور یہی اصول قرآن مجید میں مختلف مذہبی برادریوں کے بارے میں آنے والے بیانات کو سمجھنے میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔

مسیحیوں کے ساتھ مسلمانوں کا طرزِ عمل

اب تک ہم، اولاً، نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے دوران مسیحیوں کے ساتھ آپؐ کے روابط کی نوعیت اور حد کا جائزہ لے چکے ہیں، اور ثانیاً، قرآن مجید میں مسیحیوں کے بارے میں موجود مختلف بیانات کا مطالعہ کر چکے ہیں اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ان بیانات کو نبی اکرم ﷺ کے یہودیوں اور مسیحیوں دونوں کے ساتھ ارتقاپذیر مکالمات کے تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ اب ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ مسلم برادری اور عرب کے مسیحیوں کے درمیان عملی تعلقات کس طرح مرتب اور منظم ہوئے۔ اس میدان میں بھی ہم دیکھیں گے کہ یہودیوں کے ساتھ تعلقات ایک مرتبہ پھر غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے اور انہوں نے مسلم اور مسیحی برادریوں کے باہمی تعلقات کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔

نبی اکرم ﷺ کی یثرب آمد کے بعد ابتدائی اسلامی تاریخ کی ایک نہایت اہم دستاویز جسے عموماً "میثاقِ مدینہ" کہا جاتا ہے، مرتب کی گئی۔ اس دستاویز کا مقصد نووارد مسلم برادری اور ان مختلف قبائلی برادریوں کے درمیان تعلقات کو منظم کرنا تھا جو پہلے سے مدینہ میں آباد تھیں۔ ان میں بعض یہودی اور بعض عرب قبائل شامل تھے۔ تقریباً پچاس دفعات پر مشتمل اس دستاویز کی موجودہ شکل کے بارے میں "منٹگمری واٹ" کی رائے ہے کہ یہ غالباً 627ء کے بعد کی تدوین ہے لیکن اس میں ان حالات کی عکاسی ہوتی ہے جو یا تو 622ء یا تقریباً 624ء کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دستاویز مسلمانوں اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ وابستہ ہوں اور ان کے ساتھ مل کر جنگ کریں، "ایک امت" قرار دیتی ہے[43]۔ اسی طرح یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "جو یہودی مسلمانوں کی پیروی کرے گا اسے بھی ان ہی کی طرح مدد اور حمایت کا حق حاصل ہو گا[44]۔ اس دستاویز میں مذہبی تنوع کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے لیے گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ مثلاً اس میں ہے کہ "یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین[45]"۔ مزید کہا گیا ہے "یہودی اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ جو کوئی اس دستاویز کے فریقوں کے خلاف جنگ کرے گا، اس کے مقابلے میں دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ ان کے درمیان باہمی خیر خواہی، مشاورت اور باعزت برتاؤ ہو گا، خیانت نہیں ہو گی[46]۔ چنانچہ ہمارے سامنے ایک ایسی دستاویز آتی ہے جسے جدید اصطلاحات میں بھی کسی حد تک "آزاد خیال" دستاویز قرار دیا جاسکتا ہے۔ آزاد خیال اس معنی میں کہ یہ مذہبی معاملات میں بھی تنوع کو وسیع پیمانے پر تحمل کا مظاہرہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ دستاویز اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ یثرب میں موجود ہر مذہبی برادری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ مختلف برادریوں کے درمیان تعلقات میں ہر ایک کے کچھ حقوق اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، میثاقِ مدینہ ایک ایسے معاشرتی اور سیاسی نظم کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں مختلف مذہبی گروہ اپنی الگ شناخت برقرار

رکھتے ہوئے ایک مشترک سیاسی نظام کے اندر باہمی تعاون، ذمہ داری اور احترام کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

تاہم نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے چند برس بعد ہمیں مسلم اور یہودی برادریوں کے تعلقات کے لیے ایک مختلف نمونہ یا نظیر ملتی ہے جس کا تعلق "خیبر" سے ہے۔ مدینہ سے تقریباً نوے میل جنوب میں واقع خیبر ایک خوشحال زرعی بستی تھی جس کی آبادی کی غالب اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی۔ مدینہ کے یہودی قبائل میں سے ایک "بنو نضیر" جسے نبی اکرم ﷺ نے 625ء میں مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا، خیبر میں پناہ لے چکا تھا۔ مزید برآں، خیبر کے باشندوں نے مکہ اور بعض مقامی بدوی قبائل کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا تھا تاکہ نبی اکرم ﷺ کے مقاصد اور منصوبوں کو ناکام بنایا جاسکے۔ چنانچہ 628ء میں نبی اکرم ﷺ نے خیبر کے خلاف ایک فوجی مہم شروع کی اور اس کی آبادی کا محاصرہ کر لیا۔ خیبر کے باشندوں نے مزاحمت کی، لیکن چھ ہفتوں کے محاصرے کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ طے پانے والے معاہدے کے مطابق زمین نبی اکرم ﷺ کے اختیار میں دے دی گئی لیکن یہودیوں کو اس زمین کی کاشت جاری رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے بدلے میں زرعی پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو دیا جانا تھا۔ تاہم مسلمانوں نے اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھا کہ وہ جب چاہیں اس معاہدے کو ختم کر سکتے ہیں اور اگر مناسب سمجھیں تو یہودیوں کو وہاں سے بے دخل بھی کر سکتے ہیں[47]۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ اور ایک یہودی برادری کے درمیان تعلقات کا یہ نمونہ اس نمونے کے مقابلے میں کم مثبت معلوم ہوتا ہے جس کا ثبوت ہمیں "میثاقِ مدینہ" میں ملتا ہے۔ یقیناً اس کا پس منظر ایک فوجی تصادم اور جنگی صورتحال تھی۔ تاہم اس کے باوجود یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ نہ تو یہودیوں کی جانوں کو خطرہ لاحق کیا گیا اور نہ ہی انہیں اپنے مذہب پر عمل جاری رکھنے سے روکا گیا۔ اس کے باوجود معاہدے کا مجموعی لہجہ نسبتاً زیادہ سخت تھا اور معاہدے کے بعد یہودیوں کی حیثیت پہلے کے مقابلے میں زیادہ کمزور اور غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ اگر میثاقِ مدینہ مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان نسبتاً مساوی حقوق، باہمی تعاون اور مشترکہ ذمہ داریوں کے تصور کی نمائندگی کرتا تھا تو خیبر کا معاہدہ ایک ایسی صورتِ حال کو ظاہر کرتا ہے جس میں سیاسی اور فوجی غلبہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور یہودی برادری ایک تابع اور نسبتاً کمزور حیثیت میں آگئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ اور دیگر مذہبی برادریوں کے درمیان معاہدے کی تیسری اور آخری مثال تقریباً 630ء کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت عرب کے مختلف علاقوں سے وفود نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ مسلم برادری کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں مذاکرات کر سکیں۔ ابن اسحاق کے مطابق "حِمیر" کے بادشاہوں کے وفد نے اسلام قبول کرنے اور شرک کو ترک کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے جواب میں انہیں ہدایت دی گئی کہ وہ اللہ اور نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کریں اور نماز، زکوٰۃ اور دیگر اسلامی احکام پر صحیح طور پر عمل کریں۔ اس کے بعد یہودیوں اور مسیحیوں کے بارے میں ایک نہایت اہم بیان نقل کیا گیا ہے:

> "اگر کوئی یہودی یا مسیحی مسلمان ہو جائے تو وہ ایک مومن ہے اور اسے وہی حقوق اور ذمہ داریاں حاصل ہوں گی جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اور جو شخص اپنے یہودی یا مسیحی مذہب پر قائم رہنا چاہے، اسے اس کے مذہب سے نہ پھیرا جائے۔ البتہ اسے جزیہ ادا کرنا ہوگا[48]"۔

یہ بیان اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس مرحلے پر یہودیوں اور مسیحیوں کے لیے دو امکانات موجود تھے:

1. اسلام قبول کر لینا: جس کی صورت میں وہ مسلم برادری کے مکمل رکن بن جاتے اور دیگر مسلمانوں کے برابر حقوق و فرائض رکھتے۔
2. اپنے مذہب پر قائم رہنا: جس کی صورت میں انہیں اپنے مذہب پر عمل کی اجازت دی جاتی، لیکن انہیں جزیہ ادا کرنا پڑتا۔

اس طرح یہ معاہدہ نہ تو میثاقِ مدینہ کی مکمل برابری پر مبنی صورتِ حال کی نمائندگی کرتا ہے اور نہ ہی خیبر کی جنگی صورتحال کی؛ بلکہ یہ ایک ایسے نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں غیر مسلم مذہبی برادریوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی جاتی ہے، تاہم ان کی قانونی حیثیت مسلم برادری سے مختلف ہوتی ہے۔

چند ماہ بعد، ابن اسحاق کے مطابق، غالباً 631ء میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں ایک وفد نجران بھیجا گیا۔ اس وفد کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ نجران کی مسیحی اور غیر مسیحی آبادی کو یہ دوٹوک پیغام دے کہ وہ تین دن کے اندر اسلام قبول کرلیں، ورنہ ان پر حملہ کیا جائے گا۔ آبادی کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا، لیکن اس موقع پر ایک مرتبہ پھر یہ اصول بیان کیا گیا:

"جو یہودی یا مسیحی اپنی آزاد مرضی سے خلوص کے ساتھ مسلمان ہو جائے اور دینِ اسلام کی پیروی کرے، وہ ایک مومن ہے اور اسے وہی حقوق اور ذمہ داریاں حاصل ہوں گی جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو اسے اس کے مذہب سے نہ پھیرا جائے[49]"۔

دیگر ابتدائی مسلم مؤرخین نے اس معاہدے کی کچھ مختلف روایات بھی نقل کی ہیں۔ مثلاً ابن سعد نے اس معاہدے کی شرائط سے متعلق زیادہ تفصیل فراہم کی ہے۔ ان کے مطابق نجران کے باشندوں پر عائد کیے جانے والے خراج یا جزیے کی نوعیت اور مقدار کو واضح طور پر بیان کیا گیا تھا اور یہ شرط بھی شامل تھی کہ وہ سود کے لین دین سے اجتناب کریں۔ اس کے بدلے میں انہیں یہ ضمانت دی گئی کہ ان کی جان و مال محفوظ رہیں گے اور ان کے گرجاگھر اور مذہبی رہنما بھی ریاستی تحفظ سے مستفید ہوں گے[50]۔ چنانچہ 622ء سے 632ء تک مدینہ میں نبی اکرم ﷺ کی زندگی اور قیادت کے دوران مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کے متعدد نمونے سامنے آتے ہیں۔ یہ بات دراصل ان متنوع قرآنی بیانات کا ایک فطری نتیجہ ہے جن کا ہم گزشتہ حصے میں جائزہ لے چکے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ اور مسیحیوں کے بارے میں بعض مثبت بیانات موجود ہیں جو غالباً نبی اکرم ﷺ کی دعوتی زندگی کے اس درمیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں جب عرب کے یہودیوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ اسی طرح قرآن میں بعض زیادہ تنقیدی اور سخت بیانات بھی موجود ہیں جو غالباً آپؐ کی دعوتی زندگی کے آخری مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی تنوع کی عکاسی نبی اکرم ﷺ کے یہودی برادریوں کے ساتھ طرزِ عمل میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ بعض مواقع پر آپؐ کا رویہ نسبتاً رواداراور مصالحت آمیز نظر آتا ہے، جیسا کہ "میثاقِ مدینہ" میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ بعض دوسرے مواقع پر زیادہ سخت اور تصادمانہ رویہ سامنے آتا ہے جیسا کہ "خیبر" کے واقعے میں نظر آتا ہے۔ تاہم آپؐ کی زندگی کے آخری حصے میں، جیسا کہ "حِمیر" اور "نجران" کے ساتھ ہونے والے مذاکرات سے ظاہر ہوتا ہے، ایک درمیانی یا معتدل نوعیت کا موقف ابھرتا ہے۔ اس کے تحت یہودیوں اور مسیحیوں دونوں کو ایک طرح کی "مشروط قبولیت" دی جاتی ہے۔ یعنی انہیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی جاتی ہے بشرطیکہ وہ اسلامی حکومت کی پرامن بالادستی کو تسلیم کریں اور مسلم حکومت کو کسی نہ کسی نوعیت کا خراج یا جزیہ ادا کریں۔

عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ بعد میں آنے والی تعلیمات یا رویے پہلے کے خیالات کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اس لیے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد مسیحیوں کے بارے میں قرآن مجید کے ابتدائی اور نسبتاً مثبت بیانات رفتہ رفتہ فراموش کر دیے جاتے اور ان کی جگہ بعد کے زیادہ تنقیدی اور منفی بیانات کو ترجیح دی جاتی۔ لیکن مسلم مسیحی تعلقات کے اگلے مرحلے کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ ایسا ہمیشہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں مسیحیوں کے بارے میں صرف ایک ہی طرزِ فکر یا ایک ہی رویہ غالب نہیں ہوا، بلکہ مسلمانوں میں مسیحیوں کے بارے میں مختلف اور متنوع رویے سامنے آئے۔ بعض مسلم

مفکرین اور حکمرانوں نے قرآن کے ان مثبت بیانات کو اہمیت دی جن میں اہلِ کتاب اور مسیحیوں کے لیے احترام، قربت اور رواداری کا پہلو موجود تھا جبکہ بعض دوسرے حلقوں نے ان آیات اور روایات پر زیادہ زور دیا جن میں مسیحی عقائد پر تنقید کی گئی تھی۔ نتیجتاً اسلامی تاریخ میں مسیحیوں کے ساتھ تعلقات کی ایک وسیع اور متنوع روایت وجود میں آئی جس میں رواداری، مکالمہ، تعاون، تنقید، مناظرہ اور بعض اوقات تصادم، سبھی مختلف صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

نتائج تحقیق

- عہدِ نبوی میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت یک رخی نہیں تھی بلکہ اس میں مکالمہ، تعاون، مباحثہ اور سفارتی روابط کے مختلف پہلو شامل تھے۔
- سیرتِ نبوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا مسیحیوں سے رابطہ بعثت سے قبل بھی مختلف صورتوں میں موجود تھا۔
- بحیرا راہب کا واقعہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بعض مسیحی اہلِ علم نبی اکرم ﷺ کی غیر معمولی شخصیت کو بعثت سے قبل ہی محسوس کرتے تھے۔
- ورقہ بن نوفل کا کردار ابتدائی اسلامی تاریخ میں ایک ایسے مسیحی عالم کے طور پر سامنے آتا ہے جس نے پہلی وحی کے بعد نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی تائید کی۔
- حبشہ کی ہجرت مسلم مسیحی تعلقات کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے جس میں ایک مسیحی حکمران نے مظلوم مسلمانوں کو پناہ فراہم کی۔
- نجاشی اور مہاجرینِ حبشہ کے درمیان مکالمہ بین المذاہب احترام اور انصاف کی ایک نمایاں مثال ہے۔
- حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنے ابتدائی تعارف میں اخلاقی اور انسانی اقدار کو بنیادی اہمیت دی۔
- نجاشی کا مسلمانوں کے حق میں فیصلہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مذہبی اختلاف کے باوجود عدل و انصاف پر مبنی تعلقات قائم کیے جاسکتے ہیں۔
- وفدِ نجران کی مدینہ آمد مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان منظم مذہبی مکالمے کی ایک اہم مثال ہے۔
- نبی اکرم ﷺ نے نجران کے مسیحیوں کو مسجد نبوی میں عبادت کی اجازت دے کر مذہبی رواداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔
- نجران کے وفد کے ساتھ ہونے والے مباحثے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عقائدی اختلافات کو علمی اور استدلالی انداز میں زیرِ بحث لانے کی روایت قائم کی۔
- عہدِ نبوی کے مسلم مسیحی روابط میں طاقت کے توازن کی تبدیلی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے؛ حبشہ میں مسلمان کمزور فریق تھے جبکہ مدینہ میں وہ ایک مضبوط سیاسی قوت بن چکے تھے۔
- نبی اکرم ﷺ کے مسیحی حکمرانوں کو ارسال کردہ خطوط اسلام کے عالمی اور آفاقی پیغام کی عکاسی کرتے ہیں۔
- قرآن مجید میں مسیحیوں کے بارے میں بیانات یکساں نوعیت کے نہیں بلکہ مختلف تاریخی حالات اور مواقع کے مطابق متنوع ہیں۔

- بعض قرآنی آیات میں مسیحیوں کی نرم دلی، عبادت گزاری اور حق شناسی کی تعریف کی گئی ہے۔
- بعض دیگر آیات میں ان عقائد پر تنقید کی گئی ہے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق توحید کے منافی سمجھے گئے۔
- قرآن مجید کے مسیحیوں سے متعلق بیانات کو ان کے نزولی اور تاریخی سیاق وسباق سے الگ کر کے سمجھنا درست نہیں۔
- مسلم اور غیر مسلم محققین نے عہدِ نبوی کے مسلم مسیحی تعلقات کی تعبیرات میں مختلف نقطہ ہائے نظر اختیار کیے ہیں، تاہم اصل تاریخی مواد ان تعلقات کے کثیر الجہتی ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔
- سیرتِ نبوی اور قرآنی تعلیمات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام نے مسیحیوں کے ساتھ تعلقات میں انصاف، مکالمہ، احترام اور دعوت کو بنیادی اصول قرار دیا۔
- عہدِ نبوی میں مسلم مسیحی تعامل کے مطالعے سے عصرِ حاضر کے بین المذاہب تعلقات، مذہبی رواداری اور پرامن بقائے باہمی کے لیے اہم رہنما اصول حاصل ہوتے ہیں۔
- مجموعی طور پر عہدِ نبوی کا مسلم مسیحی تعامل یہ ثابت کرتا ہے کہ مذہبی اختلاف کے باوجود باہمی احترام، مکالمہ، تعاون اور انصاف پر مبنی تعلقات قائم رکھنا اسلامی تعلیمات کا اہم حصہ ہے۔

References

[1] Torrey, Charles Cutler Torrey, The Jewish Foundation of Islam (New York: Jewish Institute of Religion Press, 1933).

[2]Bell, Richard Bell, The Origin of Islam in Its Christian Environment (London: Macmillan & Company Limited, 1926).

[3] Cook, Michael Cook and Patricia Crone, Hagarism: The Making of the Islamic World (Cambridge: Cambridge University Press, 1977).

[4] Finkel, Joshua Finkel, "Jewish, Christian, and Samaritan Influences on Arabia," in The Macdonald (Duncan Black) Presentation Volume (1933), 147–166.

[5] For details See:

- Ayyūb, Aḥmad ibn Sulaymān Ayyūb, Mawsūʿat Maḥāsin al-Islām wa-Radd Shubuhāt al-Liʾām (Kuwait: Dār Īlāf al-Dawliyyah, 2015).
- ʿĀmirī, Sāmī ibn ʿĀmir al-ʿĀmirī, Hal al-Qurʾān al-Karīm Muqtabas min Kutub al-Yahūd wa al-Naṣārā? (Kuwait: Maktabat Rawāsikh, 2018).

[6] For details See: Waines, David Waines, An Introduction to Islam (Cambridge: Cambridge University Press, 1995), 265–279.

[7] The following two articles are significant for understanding the authenticity and originality of the teachings of the Prophet Muḥammad (PBUH):

- Fück, Johann W. Fück, "The Originality of the Arabian Prophet," in M. Swartz (ed.), Studies on Islam (Oxford: Oxford University Press, 1991), 86–98.
- Kronholm, Tryggve Kronholm, "Dependence and Prophetic Originality in the Koran," Orientalia Suecana 31, no. 2 (1982–1983), 47–70.

[8] See: von Denffer, Ahmad von Denffer, Christians in the Qurʾān and the Sunna (Leicester: The Islamic Foundation, 1979), 10–29.

[9] See: Guillaume, Alfred Guillaume, The Life of Muhammad: A Translation of Ibn Isḥāq's Sīrat Rasūl Allāh (Oxford: Oxford University Press, 1955), 79–81.

[10] Group of Scholars, Group of Scholars, Sīrat Encyclopedia (Lahore: Dār al-Salām, 1433 AH), 2:178–180.

[11] al-ʿAbbādī, Ziyād Salīm al-ʿAbbādī, "Khabar Buḥayrā al-Rāhib fī al-Mīzān al-Naqd al-Ḥadīthī," Majallat Jāmiʿat Umm al-Qurā li-ʿUlūm al-Sharīʿah wa al-Dirāsāt al-Islāmiyyah, no. 59 (December 2013), 85–115.

[12] See: al-Raḥmān, Muḥammad Ḥafīẓ al-Raḥmān and Ḥāfiẓ Muḥammad Sajjād, "Qiṣṣah Buḥayrā kī ʿĪsāʾī Riwāyāt: Taḥqīqī Jāʾizah," Peshawar Islamicus 9, no. 1 (2018), 37–54.

[13] Shabot, M. A. Shabot, An Evaluative Study of the Bahira Story in the Muslim and Christian Traditions (PhD diss., University of Birmingham, 1983).
[14] The Gospel of Matthew, 2:1–12
[15] Muir, William, The Life of Muhammad, P.83 , 107
[16] Ibid, P.146-150
[17] Al-Qurʾān, 4:171.
[18] Muir, William, The Life of Muhammad, P. 150-153
[19] Ibid, P. 270-277
[20] Ibid, P. 652-659
[21] The following two works may be cited in this context:
Ismāʿīl, Kāmil Muḥammad Jāhīn Ismāʿīl, "Radd Shubuhāt al-Mustashriqīn Ḥawla Rasāʾil al-Nabī ﷺ ilā al-Mulūk," Majallat Kulliyyat Uṣūl al-Dīn wa al-Daʿwah bi-Asyūṭ (2021.(
al-Wādiʿī, ʿAlī ibn Ḥāfiẓ ibn Sālim al-Wādiʿī, Fiqh al-Daʿwah fī Rasāʾil al-Rasūl ilā al-Mulūk wa al-Umarāʾ (Saudi Arabia: Jāmiʿat Ṭaybah, 1426 AH.(
[22] See: Waardenburg, Jacques Waardenburg, "Towards a Periodization of Earliest Islam According to Its Relations with Other Religions," in R. Peters (ed.), Proceedings of the Ninth Congress of the Union Européenne des Arabisants et Islamisants (Leiden: Brill, 1981), 304–326.
[23] For the details about Jews in Arabia, See:
Newby, Gordon Darnell Newby, A History of the Jews of Arabia (Columbia: University of South Carolina Press, 1988).
[24] For details See:

- Arafat, Wadie Nasri Arafat, "New Light on the Story of Banū Qurayẓah and the Jews of Medina," Journal of the Royal Asiatic Society (1976), 100–107.
- Ahmad, Barakat Ahmad, Muḥammad and the Jews: A Re-examination (Delhi: Vikas Publishers, 1979).
- Kister, Meir Jacob Kister, "The Massacre of the Banū Qurayẓah: A Re-examination of a Tradition," Jerusalem Studies in Arabic and Islam, no. 8 (1986), 61–96.
- Faizer, Rizwi S. Faizer, "Muḥammad and the Medinan Jews," Journal of Middle East Studies 28, no. 4 (1996), 463–489.

[25] Al-Qurʾān, 5:82
[26] Al-Qurʾān, 5:82–83
[27] Al-Qurʾān, 9:29
[28] Al-Qurʾān, 2:62
[29] Al-Qurʾān, 3:55.
[30] Al-Qurʾān, 3:199.
[31] Al-Qurʾān, 5:66.
[32] Al-Qurʾān, 28:52–55.
[33] Al-Qurʾān, 57:27.
[34] McAuliffe, Jane Dammen McAuliffe, Qurʾānic Christians: An Analysis of Classical and Modern Exegesis (Cambridge: Cambridge University Press, 1991), 287.
[35] Al-Qurʾān, 5:72.
[36] Al-Qurʾān, 5:73.
[37] Marshall, David Marshall, God, Muḥammad and the Unbelievers: A Qurʾānic Study (London: Curzon, 1999).
[38] Al-Qurʾān, 9:30.
[39] Al-Qurʾān, 5:116.
[40] For a detailed account of Ezra, the priest, see: Ayoub, M. Ayoub, "Uzayr in the Qurʾān and Muslim Tradition," in W. M. Brinner and S. D. Ricks (eds.), Studies in Islamic and Judaic Traditions, vol. 1 (Atlanta: Scholars Press, 1986), 3–18.
For an account of Mary (peace be upon her), see: Parrinder, Geoffrey Parrinder, Jesus in the Qurʾān (London: Faber, 1965), 133–141.
[41] For further details on this issue, see: Goddard, Hugh Goddard, Muslim Perceptions of Christianity (London: Grey Seal, 1996), chap. 1.
[42] See: The Book of Revelation of John.
[43] The first clause of the Constitution of Medina.
[44] Clause 16 of the Constitution of Medina.
[45] Clause 25 of the Constitution of Medina.
[46] Clause 37 of the Constitution of Medina. See: Muir, William, The Life of Muh.ammad, pp. 231-233.
For the complete English translation of the Constitution of Medina, see: Watt, William Montgomery Watt, Islamic Political Thought (Edinburgh: Edinburgh University Press, 1968), 130–134.

For an Orientalist analysis of the Constitution of Medina, see: Serjeant, Robert Bertram Serjeant, "The Constitution of Medina," The Islamic Quarterly 8 (1964), 1–16.
Denny, Frederick Mathewson Denny, "Ummah in the Constitution of Medina," Journal of Near Eastern Studies 36 (1977), 39–47.
For a detailed Islamic perspective on the Constitution of Medina, see: Qādrī, Ḥasan Muḥyī al-Dīn Qādrī, Dustūr-i Madīnah aur Falāḥī Riyāsat kā Taṣawwur (Lahore: Minhāj al-Qurʾān Printers, 2024), 2 vols.

[47] Muir, William, The Life of Muhammad, P. 510-518

[48] Ibid, 643.

[49] Ibid, 647, 648

[50] See: Watt, William Montgomery Watt, Muḥammad at Medina (Oxford: Oxford University Press, 1981), 359–360.